ایک شاعر، ایک غزل

وہ جبس ہے کہ ہوا کی اشد ضرورت ہے
مجھے تمہاری دعا کی اشد ضرورت ہے

اسے میں دیکھوں تو پاگل، نہ دیکھوں تو پاگل
مریض دل ہوں دوا کی اشد ضرورت ہے

وہ نا امیدی سے تنگ آ کے مر نہ جائے کہیں
اس آدمی کو خدا کی اشد ضرورت ہے

جسے نماز کا تم درس دے رہے ہو ابھی
اس آدمی کو غذا کی اشد ضرورت ہے

وہ خالی ہاتھ فراعین سے لڑے کیسے
کلیم نو کو عصا کی اشد ضرورت ہے

افسانہ

ریٹا مارٹنی سینٹرل جنیوا میں ملی تھی

کشما شرما

> بیٹے کی بات سن کر یامنی کو گھبراہٹ ہوئی۔ بڑھتی عمر ایسے ہی ڈراتی ہے۔ اپنے یہاں تو ایسی کوئی ہیلپ لائن بھی نہیں۔ ہو بھی تو کیا یامنی اس تک پہنچ سکے گی۔ وہ تو یہاں ماہ دو ماہ کے لیے ہی آتی ہے۔ بیٹا ضد کرتا ہے کہ واپس نہ جائے لیکن اتنے اکیلے پن میں من بھی نہیں لگتا۔ گھر میں دو لوگ کب تک ٹی وی دیکھیں، کب تک فون پر فلم۔ اکثر سوربھ اور وہ گزرے دنوں کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ عمر کافور کی طرح لگتی ہے جو لمحہ بھر میں اڑ گئی ہے۔ برسوں تک کا تو حساب کیا۔

جنیوا لیک کے پاس سے ہٹنے کا من ہی نہیں کرتا تھا۔ سو کلومیٹر والی یہ جھیل اپنے نیلے پن میں کسی سمندر سی دکھتی تھی۔ تیرتی بطخیں کنارے پر آکر لوگوں کے ہاتھوں سے پاپ کورن اور چپس خوب مزے لے کر کھاتی تھیں۔ کواں کواں کرکے دیر تک پکارتی تھیں کہ آؤ اور کھلاؤ۔ ایک طرف یورہ کی چوٹیاں، دوسری طرف سالیف پہاڑ اور بیچ میں سمندر نما یہ جھیل۔

یامنی کھڑے ہو کر دیکھتی رہتی تھی دیر تک۔ لہروں کو چھو کر تیز آتی ہوا بالوں کو اڑا اڑا کر آنکھوں پر لے آتی تھی۔ پانی کے چھینٹے بھی پڑتے تھے۔ کئی بار من کرتا تھا کہ ناؤ میں بیٹھ کر دور تک چلی جائے اور دیکھے کہ جھیل کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم۔

گھر سے پیدل چل کر یہاں پہنچا جا سکتا تھا۔ اکثر سویرے کا گھومنا اسی کے کنارے ہوتا تھا۔ یہاں چلتے ہوئے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اپنے ملک کا شور شرابہ، بھیڑ بھاڑ جس سے بچنے کے لیے لوگ یہاں بھاگتے تھے، وہ یاد آنے لگتی تھی۔ سچ یاد وہی کیوں آتا ہے جو دور ہوتا ہے۔ پاس رہ کر چیزیں نہ جانے کیوں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔

ایک صبح بچے کام پر چلے گئے تھے۔ چھوٹا بچہ اسکول۔ گھڑی میں ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ یامنی بھی نہا دھو کر ناشتہ کرکے باہر نکل آئی۔ سوربھ ابھی تھوڑی دیر بعد آئیں گے، ایسا انہوں نے کہا تھا۔

ہوا میں ہلکی خنکی تھی۔ بھارت میں تو لوگ ان دنوں گرمی سے پریشان ہوں گے۔ اس نے سوچا۔

سامنے پارک تھا۔ بہت بڑا۔ دور تک پھیلی ہری گھاس اور بچوں کے طرح طرح کے جھولے۔ ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول۔ یہی وقت ایسا تھا جب کچھ لوگ اپنے بچوں کے ساتھ یہاں دکھائی دیتے تھے۔

یامنی، سوربھ کے ساتھ دوپہر تک یہیں بیٹھی دیکھتی رہتی تھی۔ کچھ سوچتی رہتی تھی یا فون پر کوئی فلم دیکھتی تھی۔ بیچ بیچ میں بسوں کی آمد و رفت، کسی کا یوں ہی ماؤتھ آرگن بجاتے چلے جانا یا کسی پریم میں ایک بچہ ایک گود میں اور دوسرے ہاتھ میں پلے کی رسی تھامے عورتوں کا آنا جانا۔

کہاں تو زندگی بھر اس بات کے لیے پریشان رہی کہ کاش، کچھ خالی ٹائم ملتا۔ کچھ سانس لینے کی فرصت ملتی۔ اب جب بہت سا وقت تھا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کہاں سنبھال کر رکھے۔

اس وقت ایک جوڑا جس میں شوہر سیاہ فام تھا اور بیوی سفید فام دو بچوں کے ساتھ وہاں پہلے سے تھا۔ بچوں نے بھی ماں، باپ کے رنگوں کو بانٹ لیا تھا۔ چھوٹا بچہ گھٹنوں گھٹنوں گھاس پر بھاگ رہا تھا، باپ اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ماں دوسرے بچے کو جھولا جھلا رہی تھی اور پاس ہی کھڑی تھی، شاید اس فکر میں کہ بچہ کہیں گر نہ جائے۔ ان بچوں میں یامنی اپنے بچوں کو دیکھ رہی تھی جو اب اتنے ہی بڑے بچوں کے ماں، باپ تھے۔ اپنی عمر انگلیوں سے پھسل جاتی ہے، کبھی احساس نہیں ہوتا۔ اور بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ گزری ہوئی عمر بچوں میں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔

یامنی کو لگا کہ وہ بہت دیر سے صرف کھیلتے ہوئے بچوں کو ہی دیکھے جا رہی ہے۔ اپنے یہاں تو کوئی لڑنے ہی آجائے گا کہ بچوں کو گھور کر نظر لگائی جا رہی ہے۔ کیا پتہ، یہ لوگ بھی برا مان جائیں۔ اس نے نظر پھیر لی اور آسمان میں مسلسل اڑتے جہازوں کی قلابازیاں نظر آنے لگیں۔

ایک سے ایک رنگ برنگے پرندوں سے جہاز۔ سب کو کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں۔ مہاجر پرندوں کی طرح ہی۔

جس سڑک سے وہ چل کر آئی تھی، اسی سے ایک عمر دراز عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ یامنی اس کا نام نہیں جانتی مگر یہ پتہ ہے کہ وہ سامنے والے گھر میں رہتی ہے۔ اکثر آتی جاتی دکھتی ہے۔ سامنے سے گزرو تو تمباکو کی تیز بو آتی ہے۔ بیٹے نے بتایا تھا کہ اسّی سے اوپر کی ہے مگر اب بھی دس کلومیٹر روز دوڑتی ہے۔ اپنا سارا کام خود کرتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو پتہ ہے، انہیں ہر حال میں صحت مند رہنا ہے۔

کوئی ہے نہیں اس کا؟

بچے ہیں۔ کہیں اور رہتے ہیں۔ کبھی کبھار پھولوں کا بُکے لے کر آتے ہیں۔

ماں کو ساتھ نہیں لے جا سکتے؟ اس عمر میں اکیلی۔ کہیں کچھ ہو جائے تو؟

ارے ماں، یہ انڈیا نہیں ہے۔ یہاں سارے بوڑھے اکیلے ہی رہتے ہیں۔ کچھ گھر میں، بہت سے اولڈ ایج ہوم میں۔

یامنی کو یاد آیا کہ ہاں، جب وہ پارک میں بیٹھی ہوتی ہے تو دیکھتی ہے کہ بہت سے بوڑھے لوگ اپنے سامان کی ٹرالی خود کھینچ رہے ہیں۔ چلتے ہوئے کانپ رہے ہیں مگر چل رہے ہیں۔

اکیلے رہتے ہوئے اگر انہیں کچھ ہو جائے تو... اس نے اپنے بیٹے سے پوچھا تھا۔

ہو ہی جاتا ہے۔ گھر میں حکومت کی طرف سے ہیلپ لائنس لگی ہیں۔ بس بٹن پر ہاتھ رکھنا ہوتا ہے کہ ایمبولینس آجاتی ہے مگر کئی بار ایسی حالت نہیں ہوتی کہ بٹن تک بھی پہنچ سکیں۔

تب تو ختم ہو جاتے ہوں گے؟

ہاں، ایسا ہی ہے۔ یہی یہاں کی ریئلٹی ہے۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ لوگ کسی سے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھتے کہ آس پڑوس کا کوئی مدد کے لیے آ بھی جائے۔

بیٹے کی بات سن کر یامنی کو گھبراہٹ ہوئی۔ بڑھتی عمر ایسے ہی ڈراتی ہے۔ اپنے یہاں تو ایسی کوئی ہیلپ لائن بھی نہیں۔ ہو بھی تو کیا یامنی اس تک پہنچ سکے گی۔ وہ تو یہاں ماہ دو ماہ کے لیے ہی آتی ہے۔ بیٹا ضد کرتا ہے کہ واپس نہ جائے لیکن اتنے اکیلے پن میں من بھی نہیں لگتا۔ گھر میں دو لوگ کب تک ٹی وی دیکھیں، کب تک فون پر فلم۔ اکثر سوربھ اور وہ گزرے دنوں کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ عمر کافور کی طرح لگتی ہے جو لمحہ بھر میں اڑ گئی ہے۔ برسوں تک کا تو حساب کیا۔

کب تک خود ہی سے باتیں کرے۔ جب تک نوکری کرتی تھی، لگتا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ سب کرے گی جو زندگی بھر نوکری کی وجہ سے نہیں کر پائی لیکن اب جب کوئی کام نہیں ہے تب بھی کہاں کر پاتی ہے اپنے من کا کچھ۔ من کا کرنے کی خواہش کیا محض ایک سراب ہے جس کے پیچھے بھاگتے ہوئے عمر نکل جاتی ہے؟

وہ عورت یامنی کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی اور مسکرائی۔ یامنی نے بھی اسے نظر بھر کر دیکھا اور مسکراہٹ واپس کی۔

وہ دیر تک کسی سوچ میں ڈوبی رہی اور ایک کے بعد ایک سگریٹ جلاتی رہی۔ یامنی کو دقت ہوئی مگر کیا کرے۔ کیسے کہے کہ اسے سگریٹ ذرا بھی برداشت نہیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد اس نے انگریزی میں اپنا نام بتایا، ریٹا مارٹنی۔ اور ہاتھ بڑھایا۔ یامنی نے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا، یامنی۔ اس کی انگلیوں میں قرینے سے نیل پالش لگی تھی۔ زندگی شاید اسے ہی کہتے ہیں، جب تک جئیں، موت اور چلے جانے کے خیال کو حاوی نہ ہونے دیں۔

انڈیا سے؟ اس نے پوچھا۔

جی۔

اس نے کہا، ویسے مجھے پتہ ہے، آپ ہر سال جولائی-اگست میں یہاں آتی ہیں۔ اور وِشال دسمبر میں انڈیا جاتا ہے۔

یامنی حیران ہوئی۔ اسے تو بیٹے کا نام بھی پتہ ہے۔ اور یہ بھی کہ ہم کب آتے جاتے ہیں۔ بالکل ہندوستانی پڑوسیوں کی طرح۔ کیا انسان کی بنیادی جبلت نہیں بدلتی؟

پھر اس نے کہا، آپ کے ملک کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے۔

جی کیا؟

آپ لوگ فیملی کی بہت قدر کرتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ کا بیٹا، بہو سب ہمیشہ آپ کے ساتھ ساتھ آتے جاتے ہیں۔ ہنستے بولتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، اتوار کو آپ لوگ اکٹھے کھیلتے بھی ہیں۔

یامنی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیا، سب اوپر والے کی مہربانی ہے۔

پتہ نہیں، یہ اوپر والا ہم لوگوں پر کبھی مہربان کیوں نہیں ہوتا۔ ہم لوگ تو بس اس امید میں ہی رہتے ہیں کہ کل نہیں تو آج کچھ بدل جائے گا۔ اس نے سگریٹ کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

مطلب؟ یامنی کو اس کی باتیں ایسی لگیں جیسے کوئی روتے ہوئے چپکے سے کچھ کہہ رہا ہے۔

مطلب یہ کہ ہمارے یہاں تو ہم بچوں کی اجازت کے بغیر ان سے مل بھی نہیں سکتے۔ ان کے گھر اتنے دن رہنا تو دور کی بات ہے جتنے دن آپ یہاں رہتی ہیں۔

یامنی کو عجیب لگا، اپنے بچے نہیں پوچھتے تو دوسروں کے بچوں کو نظر لگا رہی ہے۔

وہ پھر بولی، یہ تو سب ایک دوسرے کے یہاں بس مہمان کی طرح ہی آتے جاتے رہ سکتے ہیں۔ وہ بھی پہلے سے بتا کر۔ یہاں کسی کے ساتھ کوئی نہ رہ سکتا ہے، نہ رہنا چاہتا ہے۔ ہم نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ ریٹا کے سُر میں دکھ کوندھ رہا تھا۔

اس کے سُر کے دکھ کو یامنی نے پہچانا۔ سوچنے لگی، کیا پتہ، اپنے یہاں بھی ایسے رشتے اب کتنے دن بچے ہیں۔ سب کچھ تو ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ اس عورت کو نہیں معلوم کہ کتنے بوڑھے اپنے آخری دن کن مصیبتوں میں کاٹتے ہیں۔

ریٹا نے اس کی طرف سگریٹ کا ڈبہ بڑھایا، منع کرنے پر بولی، ہاں، آپ کے یہاں عورتیں کم سگریٹ پیتی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، بہت سی انڈین عورتوں کو۔ میں ٹیلی فون ایکسچینج میں نوکری کرتی تھی نا۔ بہت سے لوگوں سے باتیں ہوتی تھیں۔ میرا بھی ایک بیٹا انڈیا میں تھا، کچھ دن تک۔

تھا مطلب؟ اب کہاں ہے؟

اب نہیں ہے۔ سب ختم۔

یعنی کہیں اور رہتا ہے؟

نہیں، اب دنیا میں ہی نہیں ہے۔

اوہ، ویری سوری۔ یامنی کو دھچکا لگا۔

آخری دنوں میں وہ میرے پاس ہی رہنے آ گیا تھا۔ ہی کیم ٹو ڈائی۔ اس کے گلے میں کچھ لرزش سی ہوئی۔

کیا ہوا تھا اسے؟

امریکہ میں تھا کئی سال۔ بس وہیں ایڈس ہو گیا۔ اچھا خاصا تن درست لڑکا جب میرے پاس آیا تو پہچانا نہیں جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے کو کسی نے کپڑے پہنا دیے ہوں لیکن خوشی ہے کہ آخری دنوں میں وہ میرے پاس رہا۔ کچھ دیکھ بھال کر لی۔ معلوم تھا کہ وہ نہیں بچے گا لیکن ہر صبح لگتا تھا کہ شاید وہ بچ ہی جائے۔ ایک دوپہر جب میں اس کے کپڑے بدل رہی تھی، وہ نہیں رہا۔

یامنی کو گھبراہٹ سی ہوئی۔ ماں کی باہوں میں بیٹے کا دم توڑنا۔ ہے ایشور...

آج بھی اس کے ڈیتھ کے دن کچھ پھول اس کی قبر پر چڑھا آتی ہوں۔ بچے بس ہماری یادوں میں اسی طرح رہ جاتے ہیں۔ سوری، آپ سے پہلی بار بات کر رہی ہوں اور آپ کو سب بتا بیٹھی۔ ریٹا نے کہا۔

یامنی کیا کہتی۔ اس کے سامنے ایک بوڑھی، بلکتی ماں تھی جو اسی کی عمر میں رات دن دوڑ رہی تھی، چل رہی تھی، سامان ڈھو رہی تھی، صرف اس لیے کہ جب تک زندہ ہے، اسے ٹھیک رہنا ہے۔ اس کے آس پاس اپنا کہنے والا کوئی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ اٹھی، میرا جاگنگ کا ٹائم ہو گیا۔ پھر ملیں گے۔ ہیوا نائس ڈے۔

یامنی کو لگا کہ کیا ساری دنیا میں بوڑھوں کا اب یہی مستقبل ہے۔ وہ تھرتھرا اٹھی۔ آسمان میں ڈھیر سے بگلے اڑ رہے تھے۔ وہ جیسے اڑتے جہازوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ریٹا کے جانے کے بعد یامنی کا من کیا کہ وہ زور سے روئے اور روتی ہی رہے۔

تبھی وہ ننھے بچے اسے پھر سے نظر آئے، وہ اپنی ماں-باپ کے پیچھے پیچھے کھل کھل کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ کہہ رہے ہوں، پکڑ لیا، پکڑ لیا۔ زندگی میں امید نہ ہو تو زندگی ہی نہ ہو۔ سامنے سے سوربھ بھی چلے آ رہے تھے۔ ■

باپ جیسی بیٹی!

یہ کہاوت مشہور ہے کہ ’جیسی ماں ویسی بیٹی‘۔ اسے مثبت اور منفی دونوں معنوں میں استعمال کی جاتی ہے مگر شروتی ہاسن کے لیے یہ کہاوت مثبت معنی میں ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ ان پر یہ کہاوت بھی فٹ بیٹھتی ہے کہ ’جیسا باپ ویسی بیٹی‘، کیونکہ اس کا شمار آج کی اچھی اداکاراؤں میں ہوتا ہے اور کئی بار ان کی اداکاری کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی والد کمل ہاسن اور ماں سارِیکا سے شروتی کو اداکاری وراثت میں ملی ہے۔ شروتی ہاسن کی پیدائش 28 جنوری، 1986 کو ہوئی تھی۔ اس سال جنوری میں وہ 35 برس کی ہو گئیں۔ اداکاری کی ابتدا شروتی نے بطور چائلڈ آرٹسٹ 2000 میں کی تھی۔ ان کی پہلی فلم ’ہے رام‘ تھی۔ یہ تمل اور ہندی میں بنی تھی۔ اس کے کلیدی کردار کمل ہاسن تھے، رانی مکھرجی اور شاہ رخ خان بھی اس فلم کا حصہ تھے۔ اس کے ہدایت کار بھی کمل ہاسن ہی تھے۔ یہ اپنے وقت کی سپرہٹ فلم تھی۔ یعنی شروتی ہاسن کو فلموں میں پہلا بریک خود ان کے والد کمل ہاسن نے دیا اور ان کی ابتدا ہی ایک کامیاب فلم سے ہوئی۔ بطور چائلڈ آرٹسٹ شروتی نے یہ احساس دلا دیا تھا کہ ان میں ایک بڑی اداکارہ بننے کی خوبیاں موجود ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج وہ جنوبی ہند کی مقبول اداکارہ ہیں، ہندی بیلٹ میں بھی ان کی مخصوص شناخت ہے۔ شروتی ہاسن آج ہندی فلموں کے مقابلے جنوبی ہند کی زبانوں میں بننے والی فلموں میں زیادہ کام کر رہی ہیں، اپنے بہترین کردار شروتی نے انہیں فلموں میں ادا کیے ہیں، وہ ہندی بیلٹ سے زیادہ جنوبی ہند میں مشہور ہیں مگر بطور اداکارہ ان کی پہلی فلم بھی ایک ہندی فلم ہی تھی۔ اس کا نام ’لک‘ تھا۔ 2009 میں بنی یہ ایک ملٹی اسٹارر فلم تھی، اس لیے غالباً شروتی کی اداکاری کا لوگوں نے زیادہ نوٹس نہیں لیا اور اس بات کی انہیں فکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس وقت وہ 23 سال کی تھیں۔ اگلی ہی فلم ’اناگنا گا او دھیرودو‘ میں شروتی نے وہ جلوے بکھیرے کہ ہٹ ہو گئیں۔ اس کے بعد کئی اچھی فلموں میں کام کرنے کا انہیں موقع ملا۔ اگلے سال بڑے بجٹ کی فلم ’سالار‘ ریلیز ہوگی۔ ■

> بطور چائلڈ آرٹسٹ شروتی نے یہ احساس دلا دیا تھا کہ ان میں ایک بڑی اداکارہ بننے کی خوبیاں موجود ہیں۔ آج یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ جنوبی ہند کی بڑی اور مقبول اداکارہ ہیں، ہندی فلموں کے حوالے سے بھی اپنی مخصوص شناخت رکھتی ہیں۔

قابل دید کوڈاگو

اپنے ملک ہندوستان میں ایک سے بڑھ کر ایک قابل دید مقامات ہیں۔ ایسے ہی مقامات کوڈاگو میں بھی ہیں۔ کوڈاگو کو ہی پہلے کورگ کہا جاتا تھا۔ یہ ریاست کرناٹک کا ایک ضلع ہے۔ اس کا ایک شاندار تاریخی پس منظر ہے۔ کاویری اور تیجسوینی جیسی کئی مشہور ندیاں اس ضلع سے گزرتی ہیں۔ ان کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہریالی اور روح افزا سکون اس طرف سے گزرنے والوں کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ یہاں کنڑ، ملیالم اور مراٹھی سمیت کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ 32.66 فیصد لوگ کنڑ اور 25.57 فیصد لوگ ملیالم بولتے ہیں۔ اکثر لوگ کوڈاگو کا شمار ہندوستان کے اہم ہل اسٹیشنوں میں کرتے ہیں، اس لیے سکون کی تلاش میں جنوبی ہند کے ہل اسٹیشن جانے والوں کی بڑی تعداد کوڈاگو آتی ہے۔ ابے آبشار اور ایروپو آبشار کے پاس جانے پر ایسا لگتا ہے جیسے وقت ٹھہر جائے اور اونچائی سے گرتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہیں۔ کاویری ندی کے کنارے ایک فاریسٹ کیمپ دوبارے آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میسور راجاؤں کے وقت میں اسی جگہ ہاتھیوں کو روایتی انداز میں ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یہاں آج بھی بڑی تعداد میں ہاتھی مل جائیں گے۔ یہاں کا ناگرہول نیشنل پارک کافی مشہور ہے۔ کوڈاگو آنے والے سیاحوں کی اس سے بھی دلچسپی رہتی ہے۔ تال کاویری میں بھی لوگوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہی جگہ کاویری کا ماخذ ہے۔ یہ جگہ برہم گری پہاڑ کے ڈھلان پر واقع ہے۔ دیکھنے والی ایک اور جگہ مڈیکیری ہے۔ یہ ایک ہل اسٹیشن ہے۔ ان جگہوں کے علاوہ بھی کوڈاگو میں کئی اور مقامات قابل دید ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں سے اس جگہ جانے کے لیے ڈائرکٹ ٹرین کی سہولت نہیں ہے، البتہ بسوں کی اچھی سہولت ہے۔ ■